پیری میں کیا جوانی کے موسم کو روئیے

میر تقی میرؔ

غزل نمبر2#

اشعار کی تشریح:

شعر نمبر۔1

پیری میں کے موسم میں کیا جوانی کے موسم کو روئیے   اب صبح ہونے آئی ہے، اک دم تو سوئیے

تشریح:

میر تقی میرؔ صوفی منش شاعر تھے، ان کے کلام میں سوزوگداز، زندگی کی بےثباتی کا تصور، صوفیانہ مزاج پایا جاتا ہے۔شاعر اس شعر میں اپنی جوانی کو یاد کر کے افسوس کرتے ہیں کہ افسوس میں نے اپنی ساری جوانی فضول کاموں میں صرف کردی۔ کوئی ایسا کام نہ کیا کہ جسے یاد کر کے میرے دل کو تسلی ہو میں کوئی کام ڈھنگ کا نا کیا۔ زندگی کے اس حصے میں میرے پاس سوائے افسوس کے کچھ نہ ہے اب میرے پاس وقت کم ہے۔ میں اچھے کام کرنا چاہتا ہوں پر میں لاچار ہوں اور اس وقت آخر میں مجھے اپنی جوانی پر افسوس ہو رہا ہے کہ کاش وہ جوانی پھر سے لوٹ آئے اور میں کوئی نیک کام کرلوں۔ شاعر کہتا ہے اے میر اب سوجاو تاکہ تمہارا غم دور ہوجائے صبح اس اُمید کے ساتھ اٹھنا کہ اگر تم جوانی میں کچھ نہ کرسکے تو کم ازکم بڑھاپے میں کوئی ڈھنگ کا کام کرلو۔

شعر نمبر۔2

اخلاصِ دل سے چاہیے سجدہ نماز میں   بے فائدہ ہے ورنہ جو یوں وقت کھوئیے

تشریح:

اس شعر میں شاعر اخلاص کے موضوع کو اُجاگر کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ ہر کام سچے دل سے اور صاف نیت سے کیا جائے تو ہر کسی کے دل کو بھی بھاتا ہے اور مقبول بھی ہوتا ہے۔ دنیاوی کام خلوص نیت سے کرنے کے ساتھ ساتھ مزہ تو تب ہے جب بندہ اپنے خالق اپنے مالک کی اطاعت اور بندگی بھی خلوص دل سے کرے۔ تاکہ اللہ تعالی اپنے بندے سے خوش ہو کیونکہ جو عبادت محض دکھاوا ہو وہ خدا کے ہاں بھی قابل قبول نہیں ہوتا اس طرح کی عبادت کا کوئی فاىدہ نہیں ہے۔ یہ تو سراسر زمین پر ٹکریں مارنے کے برابر ہے۔ کیونکہ اللہ تعالی کی بارگاہ میں صرف وہی عمل قابل قبول ہے جو کہ صدق دل سے کیا گیا ہو۔

شعر نمبر۔3

کس طور آنسوؤں میں نہاتے ہیں غم کشاں   اس آبِ گرم میں تو نہ انگلی ڈبوئیے

تشریح:

میر تقی میرؔ صوفی منش شاعر تھے، ان کے کلام میں سوزوگداز، زندگی کی بےثباتی کا تصور، صوفیانہ مزاج پایا جاتا ہے۔شاعر اس شعر میں اس دنیا کے لوگوں سے حیران ہوکر کہتا ہے کہ یہ لوگ کس قدر غم زدہ ہیں اور ان کی آنکھوں سے نکلنے والے آنسوؤں کی گرمائش اس قدر ہے کہ اگر ان میں انگلیاں ڈبوئی جائے تو وہ بھی جل جائے۔ شاعر اس شعر میں لوگوں کی ہمت کی داد دیتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ غم تکلیف اور مشکلات برداشت کرنا ہر کسی کا کام نہیں ہے۔ شاعر ان گرم آنسوؤں کو محبت میں ملے غم سے تشبیہ دیتے ہوئے کہتا ہے کہ محبت کا درد اس قدر سخت ہوتا ہے کہ سوائے عاشق کے کوئی بھی عام شخص اس کی گرمی کو برداشت نہیں کرسکتا۔ لیکن محبت کے سفیر کو دیکھیے اتنے دُکھ برداشت کرنے کے باوجود پھر بھی اپنے محبوب کے گیت گاتا ہے۔

شعر نمبر۔4

اب جان جسم خاک سے تنگ آگئی بہت   کب تک اس ایک ٹوکری مٹی کو دھوئیے

تشریح:

میر تقی میرؔ صوفی منش شاعر تھے، ان کے کلام میں سوزوگداز، زندگی کی بےثباتی کا تصور، صوفیانہ مزاج پایا جاتا ہے۔ میرؔ کی ساری زندگی غموں اور تکالیف میں گزری ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میں دکھ تکالیف برداشت کر کر کے اس قدر تنگ آگیا ہوں کہ میری برداشت اپنی آخری حد کو چھوگئی ہے۔زندگی کا ایک طویل حصہ آرام و آرائش میں گزار دینے کے بعد اب اس عمر میں یہ جسم تکلیفیں برداشت کرنے کے قابل نہیں رہا۔ بس میرا جسم میری روح پر بوجھ بن کر رہ گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں اپنے دکھوں کی ترجمانی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میرا جسم اب ایک مٹی کی ایسی ٹوکری کے مانند ہے کہ اب وہ کبھی بھی ٹوٹ سکتی ہے۔ اس ٹوکری میں اتنی ہمت بھی نہیں کہ وہ اب اس بڑھاپے کا بوجھ اٹھا سکے۔

شعر نمبر۔5

آلودہ اُس گلی کے جوہوں خاک سے تو میرؔ   آبِ حیات سے بھی نہ وَے پاؤں دھوئیے

تشریح:

میر تقی میرؔ صوفی منش شاعر تھے، ان کے کلام میں سوزوگداز، زندگی کی بےثباتی کا تصور، صوفیانہ مزاج پایا جاتا ہے۔ اُردو شاعری میں کچھ اصطلاحات کثرت سے استعمال ہوتے ہیں اور کچھ ایسے الفاظ ہوتے ہیں جو شعرواشعار کی زینت بنتے ہیں۔ اُردو شاعری میں جس قدر محبوب کو معتبر سمجھا جاتا ہے اسی طرح محبوب کی گلی کو بھی اہمیت دی جاتی ہے۔ میر اس شعر میں محبوب کے پیروں کی خاک کو ایک نعمت کا درجہ دیتے ہوئے کہتا ہے کہ اے عاشق اگر محبوب کی گلیوں کی خاک تیرے پاوں کے ساتھ لگ جائے تو بے شک تجھے آبِ حیات بھی یسر ہو تو اسے دھونا مت۔ کیونکہ یہ دھول بھی عاشق کے لیے نعمت سے کم نہیں ہے۔ محبوب کا دیدار تو دور کی بات اس کی گلی کی مٹی بھی میرے لیے مقدس ہے۔

مشق

سوال نمبر ۱۔ درست الفاظ کا انتخاب کریں۔

(الف) ہر شعر میں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مصرے ہوتے ہیں۔

الف۔ دو   ب۔ چار   ج۔ تین   د۔ پانچ

(ب) غزل کے پہلے شعر کو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کہتے ہیں۔

الف۔ ردیف   ب۔ بیت الغزل   ج۔ مقطع   د۔ مطلع

(ج) غزل کے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ میں شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے

الف۔ مطلع   ب۔ مقطع   ج۔ درمیان   د۔ آغاز

(د) میرؔ کو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کہا گیا۔

الف۔ خدائے سخن   ب۔ بابائے اردو

ج۔ بلبلِ ہند   د۔ اردو غزل کا باواآدم

سوال نمبر ۲۔ کہیں کیا جو پوچھے کوئی ہم سے میرؔ
جہاں میں تم آئے تھے، کیا کر چلے

میرؔ کی غزل کے اس مقطع کی تشریح کریں نیزیہ بھی واضح کریں، کہ اس میں علم کی بیان کی کون سی خوبی پائی جاتی ہے؟

جواب: اس شعر میں علمِ بیان کی خوبی "کنایہ "پائی جاتی ہے جبکہ اس شعر میں کنایہ کی قسم "کنایہ قریب " استعمال ہوا ہے۔ جس سے مراد وہ کنایہ ہے جس کو سمجھنے کے لیے زیادہ غوروفکر کرنا پڑے اور وہ آسانی سے سمجھ میں آجائے۔ مذکورہ شعر میں انسان کے اس دنیا میں بھیجے جانے کے اصل مقصد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

تشریح:

اس شعر میں میر تقی میرؔ اپنی زندگی پر کف افسوس سے ملتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم جس مقصد کے لیے اس دنیا میں آے تھے وہ پورا نہ ہوسکا۔ انسان کو اس دنیا میں اللہ کا حکم بجا لانے کے لیے بھیجا گیا۔ لیکن انسان اپنے دنیا میں آنے کا مقصد بھول کر بس دنیا کاہی ہو کر رہ گیا۔ میرؔ بھی اس شعر میں نہایت افسوس کا اظہار کرتے ہوے کہتے ہیں کہ ساری عمر اللہ کی نافرمانی کی فقط عشق مجازی کے حصول کے لیے شاعر کہتا ہے میں اپنے محبوب کی خوشی کے لیے ہر وہ کام کرتا گیا جس سے خدا نے منع کیا۔ لیکن یہ سب کرنے کے بعد بھی مجھے کچھ حاصل نہ ہوا۔ شاعر کہتا ہے کہ اب اگر مجھ سے کوئی پوچھے کہ میاں دنیا میں آکر کیا تیر چلالے تو میرا جواب سوائے خاموشی کے کچھ نہ ہوگا۔ اس دنیا میں انسان کو اللہ کی عبادت اور اطاعت کے لیے بھیجا گیا ہے۔

سوال نمبر ۳۔ مندرجہ زیل مصرعوں کے ساتھ دوسرا مصرع لگا کر شعر مکمل کریں۔

(الف) فقیرانہ آئے صدا کر چلے   (ب) وہ کیا چیز ہے آہ جس کے لیے

(ج) دکھائی دیئے یوں کہ بے خود کیا   (د) پرستش کی یاں تک کہ اے بت تجھے

(ہ) کہیں کیا، جو پوچھے ہم سے کوئی میر

جواب: (الف) فقیرانہ آے صدا کر چلے	میاں! خوش رہو ہم دعا کر چلے
(ب) وہ کیا چیز ہے آہ جس کے لیے	ہر اِک چیز سے دل اٹھا کر چلے
(ج) دکھائی دیے یوں کہ بے خود کیا	ہمیں آپ سے بھی جُدا کر چلے
(د) پرستش کی یاں تک کہ اے بت تجھے	نظر میں سبھوں کی خدا کر چلے
(ہ) کہیں کیا، جو پوچھے ہم سے کوئی میر	جہاں میں تم آے تھے، کیا کر چلے

سوال نمبر ۴۔ میرؔ کی شاعرانہ خصوصیات پر نوٹ لکھیں۔

<u>میر تقی میرؔ کی شاعرانہ خصوصیات</u>

جواب: میر تقی میرؔ کی شخصیت میں جو چیز ہر انسان کو انکی شخصیت کا گرویدہ بنادیتی ہے وہ ان کی خودداری اور قناعت پسندی ہے خودداری کا تو خیر ذکر ہی کیا لیکن قناعت کا عالم یہ کہ بقول محمد حسین آزاد صاحب "قناعت اور غیرت حد سے بڑھی ہوئی تھی اسی کا نتیجہ تھا کہ اطاعت تو درکنار نوکری کے نام کو بھی برداشت نہ رکھتے تھے نتیجہ یہ کہ فاقے کیا کرتے اور دُکھ بھرتے تھے۔ اُردو میں بہت کم شاعر ایسے گزرے ہیں جن کی زندگی اور شاعری میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ یہ خوبی میرؔ کے یہاں ملتی ہے۔ ان کی زندگی درد سے معمور تھی۔ بچپن ہی سے آرام و مصیبت کا شکار ہونا پڑا۔ اپنوں کی بے رخی، تنگ دستی، دل کی بربادی، محبت میں ناکامی اور نامرادی کا منہ دیکھنا پڑا۔ انھیں زندگی میں کہیں اُمید کا ستارہ چمکتا ہوا نظر نہ آیا۔ ان حالات نے ان کے احساس اور خوددار دل پر گہرا اثر ڈالا اور ان کی زندگی غم والم کا مجموعہ بن گی۔

میر تقی میرؔ کا عہد افراتفری اور طوائف الملوکی کا عہد تھا۔ سنہ ۱۷۰۷ء میں اورنگزیب کا انتقال کے بعد مغلیہ حکومت انتشار کا شکار ہوگی تھی۔ اکیلے دہلی کیا پورے ملک سیاسی، سماجی اور تہذیبی حالات ایسے تھے، جس میں کسی کو راحت وقرار حاصل تھا اور نہ سکون واطمینان۔ معاشی فارغ البالی خواب وخیال تھی۔ ان داخلی اور خارجی اثرات کے زیر میرؔ کی شخصیت اور شاعری کی نشونما ہوئی۔ اگر میر میں زمانے کی چوٹ

[redacted]

اور زخم کھانے کی جرات نہ ہوتی تو زمانے کی بھیانک آندھی کے سامنے ان شخصیت اور شاعری کا چراغ گل ہوجاتا۔ اس لیے میر کی رام کہانی اس عہد کی داستان معلوم ہوتی ہے۔ میر کی تنہائی پسندی اور خلوت نشینی انھیں اپنے عہد اور ماحول کی ترجمانی سے باز نہ رکھ سکی اس عہد کی افراتفری، زہنی انتشار، سکون کی تلاش، شرفا کی پریشان حالی اور معاش کی قلت کی جیتی جاگتی تصویریں ہمیں ان کے کلام میں ملتی ہیں۔ لیکن یہ باتیں تشبیہوں اور استعاروں میں کہی گی ہیں۔ اس آپ بیتی اور جگ بیتی میں انھوں نے محض سخن پروری اور قافیہ پیمائی نہیں بلکہ معنی آفرینی کی سرحدوں کو بھی پار کرگئے۔ ان داخلی اور خارجی اثرات نی میرؔ کو اتنا مایوس اور پژمردہ بنادیا کہ یہ پژمردگی طبیعت ثانیہ بن کر ان کی روح میں سرایت کرگی اس لیے ان کے حسین نغمے چوٹ کھائے ہوے دل اور بربادشدہ زندگی کے آئینہ دار ہیں غرضیکہ ان کے سوزوگداز کا سرچشمہ خود ان کی المناک زندگی اور اس وقت کے پر آشوب حالات ہیں۔ اسی لیے میر کی غزلیں شاعری، شکستگی، دل یاجنون آگہی کو قابل دید بنانے کی فنکارانہ کوشش کہی جا سکتی ہے۔

<u>غزل کی تعریف</u>

غزل کا لفظ عربی زبان کا ایک مصدر ہے۔ جس کے معنی "کاتنا" (چرخے پرروئی سے سوت "دھاگہ" بنانا) ہے۔

ادب کی رُو سے غزل کے معنی ہیں عورتوں سے باتیں کرنا، عورتوں کے حُسن وجمال کی تعریف کرنا۔

غزل نظم کی ایسی صنف ہے جس میں عشق ومحبت (حقیقی ومجازی) کا ذکر ہوتا ہے۔

غزل کے کم ازکم اشعار کی تعداد پانچ اور زیادہ کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔